نسیب

حفیظ تائب

القمر انٹرپرائزز غزنی سٹریٹ اُردو بازار ○ لاہور

خوبصورت، معیاری کتابیں

القمر انٹرپرائزز
اہتمام: محمد سعید اللہ صدیقی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

اشاعت اوّل: 2003ء
مطبع: زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
سرورق: ساجد قریشی
قیمت: -/100 روپے

انتساب

محترم احمد ندیم قاسمی

اور

پیارے خالد احمد

کے نام

حسنِ ترتیب

	صفحہ نمبر
نعت نگار حفیظ تائب کی غزل احمد ندیم قاسمی	11
نامِ حق سے جو پرچم کھلا حمد کا (حمد)	15
الطاف تیرے خَلق پہ ہیں عام اے کریم (مناجات)	17
وہ نورِ جاں افق آرا ہوا ہے (نعت)	19
شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار (قصیدۂ غالب)	23
غزل	31
سودائے سراب دے گئے ہیں	33
اک درد سا پہلو میں مچلتا ہے سرِ شام	37
بھول بھی جا کس طرح گزارا پچھلا دن ہے	39
مان لیتے ہیں بُرے آپ طبیعت کے نہیں	41
منزل ہے روبرو جو ہے سمتِ سفر درست	43
دل کو یقین اس کی محبت کا آ گیا	45
طوفاں میں جب بحال ہیں صحرا کے خط و خال	47
اے مری بوقلموں محزونی	49

مرکز سے اپنے میں ہوں کچھ ایسے ہٹا ہوا 53

شامِ غربت میں وہ مہ رو بھی نہیں 55

طلبِ سود کہاں کام آئی 57

عجب رفعتوں کے سزاوار ہیں ہم 59

راز اب کوئی راز بھی تو نہیں 61

کسک جس دن سے کم کم ہو گئی ہے 63

گزرا جو درد حد سے تو میں نے کہی غزل 65

آنکھ سے مہتاب جب اوجھل ہوا 67

اک نیا کرب مرے دل میں جنم لیتا ہے 69

شعر کی قدر شہر میں کیا تھی 71

ذہن و دل کو بسا گئی خوشبو 73

کیوں نہ دل کو ہو تیری یاد عزیز 75

منزلِ جاناں کتنی کڑی ہے 77

غم پیار میں پائے ہیں کیا کیا ہم نے غمِ دوراں سے پہلے 79

بے کیف ہے حیات کوئی پوچھتا نہیں 81

میں ہوں اور گردشِ ایّام خدا خیر کرے 83

غم سے اس درجہ پیار ہے دل کو 85

کہتا ہے کون تجھ سے مسرّت کی بھیک دے 87

دل کی ہر ایک بات کے آئینہ دار ہیں	89
زندگی جب سے ترے نام کی جاگیر بنی	91
لائے ہیں رنگ اشک ہمارے فراق میں	93
آپ کا نقشِ پا غنیمت ہے	95
مت جاں مجھ پہ سلسلہ آزار کا رُکا	97
کسی کی جستجو میں سوچنے کی کس کو فرصت ہے	99
پورے نہ ہو سکے کبھی آسودگی کے خواب	101
پردیس میں اس طور ہے یاروں کا تصور	103
لفظ سے جب نہ اٹھا بارِ خیال	105
اسیرِ غم جو نہ ہوتے تو زندگی کیا تھی	107
نت نئے داغ، نت نئے چرکے	109
وہ لب پہ پیار کا اقرار لائے	111
جب سے مجھ کو جنوں نہیں اے دوست	113
وہ زخم تھا جو پھوٹا	115
نہ سمجھو غم جو بڑھ جاتے ہیں پلکیں بھیگ جاتی ہیں	117
گزرتے سر سے محشر دیکھنے تھے	119

نعت نگار حفیظ تائب کی غزل

احمد ندیم قاسمی

نعت عموماً غزل کی ھیئت میں کہی جاتی ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض ایسی نعتیہ نظمیں بھی کامیاب رہی ہیں جو گیتوں یا نظمِ آزاد یا نظمِ معریٰ کی ھیئت میں لکھی گئی ہیں مگر نعتوں کی اکثریت غزل ھی کی ھیئت میں تخلیق ہو رہی ہے۔ میرا نظریہ ہے کہ جو شاعر کامیاب غزل کہہ سکتا ہے وھی کامیاب نعت کہنے پر قدرت رکھتا ہے اور میرے اس نظریے کی بلیغ ترین مثال حضرت حفیظ تائب ہیں جنھوں نے غزل ہی سے تخلیقِ فن کا آغاز کیا تھا اور ان غزلوں میں ایسا ایسا نشتر شعر کہا تھا، کہ میں اور ان کے عزیز دوست اختر حسین جعفری ان کی نعت نگاری کے عروج کے دور میں بھی ان کے پیچھے پڑے رہتے تھے کہ نعت کے ساتھ غزل بھی کہتے رہیے۔

حال ہی میں جب حفیظ تائب صاحب اپنی غزلوں کا مسودہ مرتب کر کے میرے پاس تشریف لائے تو میری مسرت کا ٹھکانا نہ تھا۔ آخر جس شاعر نے غزل کے بے شمار ''نشتر'' شعر کہے ہوں، اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ غزل ترک کر دے۔ اس کا غزل گوئی سے دست کش ہونا قدرت کی بخشی ہوئی ایک نعمت کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔

تائب صاحب کی غزل کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ غزل کی اس روایت سے انھوں نے اپنے فن کو آلودہ نہیں ہونے دیا جس نے غزل کو تماشا سا بنا کر رکھ دیا تھا کہ کہیں رعایتِ لفظی کے پھول کھلائے جا رہے ہیں تو کہیں زیادہ سے زیادہ قوافی جمع کرنے کی استادی کے مظاہرے ہو رہے ہیں۔ تائب کی غزل صحیح معنوں میں جدید غزل ہے کہ وہ اپنے عصری حقائق اور اپنے گرد و پیش کی صورتِ حالات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔

مثلاً وہ کہتے ہیں:

ہر آن نئے سوال تائب
اعصاب جواب دے گئے ہیں

ہم سا بے مایہ کوئی کیا ہو گا
اپنی آنکھوں میں تو آنسو بھی نہیں

لفظ لو دینے لگے ہیں تو تعجب کیسا
کیا تقاضے یہ مرے عہد کی ظلمت کے نہیں؟

ہر کوئی کرتا ہے یوں من مانی
جیسے قانون ہو لا قانونی

کم سخن، جور کش کم نظری
فائز مسند فن ، باتونی

دراصل حفیظ تائب صاحب کو کامل ادراک حاصل ہے کہ وہ اٹھارویں یا انیسویں صدی کی بجائے بیسویں صدی کے بھی نصف آخر کے شاعر ہیں اور انھیں اسی کی نمائندگی کرنا ہے۔ سو وہ کہتے ہیں:

اپنی طرف سے بھی مجھے کچھ کہنے دیجیے
کب تک سنائے جاؤں سبق میں رٹا ہوا

اسی ادراک نے انھیں مکمل مایوسی کا شکار نہیں ہونے دیا اور وہ پورے اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں کہ انسانیت آخر کار سنبھالا لے گی:

مسکراتا ہے روشنی کا نگر
اڑتی اڑتی سی دھند کے اس پار

بھول بھی جا، کس طرح گزارا پچھلا دن ہے
آج ہمارے مستقبل کا پہلا دن ہے
کھول دریچہ کوئی، کالی دیواروں میں
باہر دیکھ کہ کیسا اجلا اجلا دن ہے

اندھیروں کے جنگل میں ہیں پا شکستہ
مگر عازمِ شہرِ انوار ہیں ہم

گوشے گوشے میں ہے پتّوں کی بہار
صحن سونے تھے، خزاں کام آئی

یہ خزاں میں بھی بہار کے پہلو دیکھ لینے والا شاعر اگر اداس بھی ہوتا ہے تو یہ اداسی بھی تخلیقی اثبات رکھتی ہے:

زندگی سوت کی انٹی ٹھہری
دل نے کاتا اسے پونی پونی

حفیظ تائب کی یہ اداسی بھی اگر کوئی استعارہ ڈھونڈتی ہے تو اس کے گرد و پیش کا ماحول بھی اسے اس استعارے کا سامان مہیا کر دیتا ہے:

یہ دل ہے مرا، یا کسی کنیا کا دِیا ہے
بجھتا ہے دمِ صبح تو جلتا ہے سرِ شام

یہ اداسی شاعر کو رجائیت سے باز نہیں رکھ سکتی، چنانچہ وہ اس عالم میں بھی جس مسرّت کا اظہار کرتا ہے وہ سراسر تعمیری ہے:

کاش وہ وقت آ جائے جب سچ مچ کہہ پائیں
ہر شب اپنی شب ہے، ہر دن اپنا دن ہے

یہ بات بھی نہیں کہ حفیظ تائب غزل کے اس مرکزی اور دائمی موضوع سے دست کش ہو گئے ہیں جس نے غزل کو آج تک زوال پذیر نہیں ہونے دیا۔ یہ حسن و عشق کا موضوع ہے جس نے اردو اور فارسی غزل کو صدیوں سے چار چاند لگا رکھے ہیں۔ اس ضمن میں حفیظ تائب کے کمالات منفرد ہیں:

بنتا ہے وہ اک چہرہ کبھی گُل، کبھی شعلہ
سانچے میں خیالوں کے، جو ڈھلتا ہے سرِ شام

—

سوچوں کی گونج تھی کہ قیامت کی گونج تھی
اس کا سکوت حشر کے منظر دکھا گیا

وہ جب شرمندہ ہوتے ہیں تو ہنس پڑتا ہوں میں اکثر
وہ جب احسان گنواتے ہیں، پلکیں بھیگ جاتی ہیں

حفیظ تائب کا نظریۂ حق نہایت صائب اور جاندار ہے اور ان کی ساری شاعری اسی نظریاتی خود اعتمادی کا ثمر ہے۔ انھوں نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر کہا ہے:

فن وہ فن ہی نہیں مرے نزدیک
جو سکھاتا ہو زندگی سے فرار

اور ذرا اس نظریاتی توانائی کا سلسلہ عمل دیکھیے:

رنگ پاتا ہے مرے خونِ جگر سے گُلِ شعر
سبزۂ فکر مری آنکھ سے نُم لیتا ہے

اور یہ اتنی بڑی سچائی کا اعلان ہے کہ حفیظ تائب کے فن کے حوالے سے اس کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔

☆☆☆☆

زمزمۂ حمد

نامِ حق سے جو پرچم کھلا حمد کا
رنگ چاروں طرف چھا گیا حمد کا

لحظہ لحظہ ہے شانِ الٰہی نئی
ذائقہ بھی ہے پل پل نیا حمد کا

نیم شب کو نجوم اس کی باتیں کریں
صبحدم چھیڑے نغمہ صبا حمد کا

شامل اس میں خلائق جہاں در جہاں
از ازل تا ابد سلسلہ حمد کا

اس کی تسبیح کرتے ہیں سب نجم و گُل
کارواں ہے رواں جا بجا حمد کا

تُو بنوَ اس کے امکان آشوب میں
دَور چلتا رہے گا سدا حمد کا

اس کو پھیلانا چاہوں حدِ عمر تک
جب ملے لمحۂ دلکشا حمد کا

حمد کرنے میں احمد سا کوئی نہیں
جسکے دم سے ہے گلشن ہرا حمد کا

کیا خبر ہے کہ تائب وہ مقبول ہو
جو بیاں رہ گیا اَن کہا حمد کا

مناجات

الطاف تیرے خَلق پہ ہیں عام اے کریم
تیرے سپرد ہیں مرے سب کام اے کریم

معبود و کار ساز تجھے مانتا ہوں مَیں
مجھ پر رہیں سدا ترے انعام اے کریم

امّت ترے حبیبؐ کی ہے مشکلات میں
وا اس پہ کردے پھر درِ انعام اے کریم

ملّت کے بال و پر کو بچا ہر گرفت سے
پھیلے ہوئے ہیں چاروں طرف دام اے کریم

اقوامِ دہر اس سے سبھی فیض یاب ہوں
پھر ارتقاء پذیر ہو اسلام اے کریم

اخلاق کی مہک سے ہوں الفاظ مشکبار
پھیلاؤں یوں رسولؐ کا پیغام اے کریم

دیکھوں طلوعِ فجر کا منظر مدینے میں
مکّہ کی وادیوں میں ہو گر شام اے کریم

تن سے نکل کے روح نثارِ حضورؐ ہو
تائبؔ کا ہو شہیدی سا انجام اے کریم

دنیا کی کشمکش میں رہا ہوں میں بے قرار
خاکِ بقیع میں ملے آرام اے کریم

نغمۂ نعت

وہ نورِ جاں افق آرا ہوا ہے
ہر اک غنچہ ثنا پیرا ہوا ہے

اتر آیا ہے کیسا موسمِ گُل
بہاراں آشنا صحرا ہوا ہے

منڈیر اپنی ہے روشن جس کے اوپر
دِیا اس نام کا رکھا ہوا ہے

محبِّ انس و جاں کی ہے محبت
وہ جس سے میرا دل پگھلا ہوا ہے

جدا کعبے سے ہوتے ہیں محمدؐ
یہ منظر آنکھ میں ٹھہرا ہوا ہے

رفیقِ غار کو پا کر پریشاں
پئے تسکیں کوئی گویا ہوا ہے

تکے جاتی ہے اس کو اُمِّ معبد
جو مہتاب اس کے گھر اترا ہوا ہے

ثنیہ سے اُدھر کچھ بچیوں نے
خوشی کا زمزمہ چھیڑا ہوا ہے

مدینے میں ہے کس کا خیر مقدم
ہر اک نے بابِ دل کھولا ہوا ہے

مرے سرکارؐ ہی کے دم قدم سے
مزاجِ زندگی بدلا ہوا ہے

انہی کا خوانِ رحمت ہے جو تائب
افق سے تا افق پھیلا ہوا ہے

☆☆☆☆

شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار

کچھ عجب کشمکش سے دل ہے دوچار
مجھ کو گھیرے ہیں اَن گنت افکار

سمٹا سمٹا ہے شہرِ تخئیل
سہما سہما ہے فکر کا رہوار

قصد ہے خارزارِ مدحت کا
گرچہ پائے خیال ہیں افگار

مدحِ غالب زمینِ غالب میں
جو ہے میرے شعورِ فن کی پکار

جس کا دریوزہ گر ہے شغر مرا
ذوق میرا ہے جس کا ریزہ خوار

مرحلہ ہے بڑا کٹھن درپیش
وا کروں کس طرح لبِ گفتار

طفلکِ دل مچل رہا ہے مگر
دیکھ کر جادۂ طلب پُر خار

اک طرف پاسِ عظمتِ ممدوح
دوسری سمت طبعِ سہل انگار

ربِّ صَوت و صدا مدد فرما
تاکہ آساں ہو منزلِ دشوار

اے ادیبِ شہیر و زندہ ضمیر
اے سخندانِ انقلاب آثار

اے تکلّم کے آبشارِ بلند
اے تفکّر کے قلزمِ زخّار

برجِ بینش کے نیّرِ تاباں
درجِ دانش کے گوہرِ شہوار

آسمانِ ادب کے ماہِ منیر
گلستانِ سخنوری کی بہار

میرے طاقِ ہنر کی زینت ہیں
تیری طبعِ رسا کے نقش و نگار

دائمی تیرے اجتہاد کا رنگ
سرمدی تیرے فکر کی مہکار

غالبِ عہد آفریں تو ہے
کاروانِ خیال کا سالار

میں ہی تیرا نیاز مند نہیں
جملہ اہلِ نظر ہیں باج گزار

نذر کرتا ہے ارمغانِ غزل
تیری خدمت میں تیرا مدح نگار

(غ)

رنگ لایا ہے دیدۂ خونبار
دیکھ کنجِ افق ہوا گلنار

اب تو ہے جاں بلب سیاہیء شب
اب تو روشن ہیں صبح کے آثار

موسمِ گُل کی آمد آمد ہے
مہکے مہکے ہیں کوچہ و بازار

اب تو ہر داغ بن چکا ہے چراغ
اب ہے کیا وجہِ یاس اے دلِ زار

مسکراتا ہے روشنی کا نگر
اڑتی اڑتی ہے دھند کے اس پار

اے حوادث کی تند و تیز ہوا
ہم کو مت جان ریت کی دیوار

خامشی تھی بڑی اذیت ناک
میں نے ہنس کر پیا سمِ اظہار

فن وہ فن ہی نہیں مرے نزدیک
جو سکھاتا ہو زندگی سے فرار

تو بھی اپنی روش بدل تائب
رو بہ تغییر ہیں سبھی اقدار

چل غزالِ غزل دکھاؤں تجھے
دشتِ مدحت میں اپنے فن کی بہار

اے فصاحت کے چشمۂ شیریں
اے بلاغت کی جوئے خوش رفتار

غالبِ نامور دیا تو نے
جذبۂ دل کو پیکرِ اظہار

ولولوں کو زبان دی تو نے
فکر و فن کو دیئے نئے معیار

دے کے روحوں کو ایک طرفہ گداز
کر دیا ذہن و دل کو باغ و بہار

وجہِ بالیدگیٔ فکر و نظر
تیرے جاں بخش و دلنشیں اشعار

تیری تقلید کی مجال کہاں
غالبِ نکتہ دان و معجزہ کار

تیرے اسلوب کی مثال کہاں
اے نئے قصرِ شعر کے معمار

''اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں''
''شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار''

☆☆☆☆

غزل

o

سودائے سراب دے گئے ہیں
کیا کچھ ہمیں خوب دے گئے ہیں

سوچوں کی اداس ٹہنیوں کو
زخموں کے گلاب دے گئے ہیں

روحوں کی سپاٹ وسعتوں کو
حیرت کے سحاب دے گئے ہیں

سانسوں کی خموش ندیوں کو
موجوں کے رباب دے گئے ہیں

ویران دلوں کے ساحلوں کو
کیا کیا درِناب دے گئے ہیں

جھیلوں کے دراز دامنوں کو
عکسوں کی کتاب دے گئے ہیں

برسوں کے تھکے مسافروں کو
عرصوں کے نصاب دے گئے ہیں

چہرے پہ بکھرتی جھریوں کو
اندوہِ شباب دے گئے ہیں

اچھا ہے وہ ہم زیاں کشوں کو
ادراکِ حساب دے گئے ہیں

ہر آن نئے سوال تائب
اعصاب جواب دے گئے ہیں

☆☆☆☆

o

اک درد سا پہلو میں مچلتا ہے سرِ شام
جب چاند جھروکے میں نکلتا ہے سرِ شام

بے نام سی اک آگ دہک اٹھتی ہے دل میں
مہتاب جو ٹھنڈک سی اگلتا ہے سرِ شام

کچھ دیر شفق پھولتی ہے جیسے افق پر
ایسے ہی مرا حال سنبھلتا ہے سرِ شام

یہ دل ہے مرا یا کسی کٹیا کا دیا ہے
بجھتا ہے دمِ صبح تو جلتا ہے سرِ شام

بنتا ہے وہ اک چہرہ کبھی گل، کبھی شعلہ
سانچے میں خیالوں کے جو ڈھلتا ہے سرِ شام

چھٹ جاتی ہے آلامِ زمانہ کی سیاہی
جب دور تیری یاد کا چلتا ہے سرِ شام

میں دور بہت دور پہنچ جاتا ہوں تائب
رخ سوچ کا دھارا جو بدلتا ہے سرِ شام

☆☆☆☆

o

بھول بھی جا کس طرح گزارا پچھلا دن ہے
آج ہمارے مستقبل کا پہلا دن ہے

گزری رات پرانے غم سے بوجھل بوجھل
لیکن صورت نئی دکھانے والا دن ہے

لمحہ لمحہ، ساعت ساعت جان غنیمت
حال کا محضر، فردا کا سرنامہ دن ہے

کھول دریچہ کوئی کالی دیواروں میں
باہر دیکھ کہ کیسا اجلا اجلا دن ہے

گرتے دریاؤں پر اتریں رنگ براتیں
تاباں تاباں شب ہے یا پھر چڑھتا دن ہے

دور دیاروں میں سینے سے ہوک اٹھاتا
خوش منظر، لیکن بے چہرہ عید کا دن ہے

کاش وہ وقت آجائے جب سچ مچ کہہ پائیں
ہر شب اپنی شب ہے ہر دن اپنا دن ہے

آج ہے دن سرکارؐ مدینہ کی بعثت کا
نعرہ زناں ہیں بے بس آج ہمارا دن ہے

☆☆☆☆

○

مان لیتے ہیں بُرے آپ طبیعت کے نہیں
ہم کہ تسلیم کے خوگر ہیں شکایت کے نہیں

الجھنیں جتنی بھی ہیں ہم نے ہی پیدا کی ہیں
ہم جو شاکی ہیں تو اپنے ہیں مشیّت کے نہیں

بالا دستی کا فسوں اسلحہ کاری کا جنوں
یہ ذرائع تو ہلاکت کے ہیں عظمت کے نہیں

لفظ لو دینے لگے ہیں تو تعجب کیسا
کیا تقاضے یہ مرے عہد کی ظلمت کے نہیں

کس توقع پہ سرِ راہگذر بیٹھے ہو
لوگ ساتھی ہیں تو عشرت کے ہیں عسرت کے نہیں

ٹوٹتے دیکھے ہیں ان آنکھوں نے خوں کے رشتے
کوئی بتلائے یہ آثار قیامت کے نہیں؟

اس قدر غور سے کیا دیکھ رہے ہو تائب
اتنے مبہم بھی تو الفاظ عبارت کے نہیں

☆☆☆☆

○

منزل ہے روبرو جو ہے سمتِ سفر درست
کیا غم ہے جو نہیں ہیں مرے بال و پر درست

کمزوریٔ بدن کی شکایت نہ ہو مجھے
رکھے خدائے پاک جو فکر و نظر درست

اس خوں کے لوتھڑے سے عبارت ہے زندگی
سب کچھ درست جان، رہے دل اگر درست

سمجھوں کہ آ گیا ہے زمانے میں انقلاب
ہو جائیں گر غریب کے شام وسحر درست

انسانیت کے درد سے جو بہرہ مند ہو
جذبہ وہی ہے راست وہی نغمہ گر درست

بھولے نہ جو شناخت کبھی گردوپیش کی
رکھتا ہے وہ خیال ہمیشہ اثر درست

جو اپنے خال وخد کو بگڑنے نہ دے کبھی
تائب میری نظر میں ہے بس وہ ہنر درست

☆☆☆☆

o

دل کو یقین اس کی محبت کا آ گیا
مڑمڑ کے دور تک جو مجھے دیکھتا گیا

سوچوں کی گونج تھی کہ قیامت کی گونج تھی
اُس کا سکوت حشر کے منظر دکھا گیا

یا اُس کی آرزو مجھے لے آئی اِس طرف
یا میرا شوق راہ میں صحرا بچھا گیا

سمٹا خیالِ یار تو گلرنگ اشک تھا
پھیلا تو مثلِ دشتِ وفا پھیلتا گیا

اب ان کی تازگی سے عبارت ہے زندگی
رنجش کے جو نقوش کوئی چھوڑتا گیا

جاں ہار تو گیا کوئی کوئے مراد میں
پتھر سے دل میں پھول وفا کے کھلا گیا

☆☆☆☆

o

طوفاں میں جب بحال ہیں صحرا کے خطّ و خال
بدلے ہیں کیوں پھر ارضِ تمنا کے خطّ و خال

اتنی ہی دبتی جاتی ہے انسانیت کی روح
جتنے سنورتے جاتے ہیں دنیا کے خطّ و خال

پانی کو گزرے ایک زمانہ گزر گیا
سمٹے ہیں اب تو ریت میں دریا کے خطّ و خال

نادیدہ وادیوں کی کراتے ہیں مجھ کو سیر
یاد آتے ہیں جو اس رخِ رعنا کے خطّ و خال

کیا کچھ نہ محو ہو گیا قرطاس ذہن سے
بھولے نہ ایک یارِ شناسا کے خطّ و خال

یکسانیت کے پیچھے ہیں نیرنگیاں کئی
گو ایک سے ہیں گنبدِ مینا کے خطّ و خال

تائب ہمارے سامنے کتنے بدل گئے
اظہار کے تلازمے، ایما کے خطّ و خال

☆☆☆☆

o

اے مری بو قلموں مخزونی
کس کا جادو ہے تری گل گونی

زندگی سوت کی انٹی ٹھیری
دل نے کاتا جسے پونی پونی

بند آنکھوں ترا رستہ دیکھا
عمر کی چھاؤں رما کر دھونی

میرے احوال کی زندہ تصویر
میرے ماحول کی ناموزونی

چین پایا نہ درونِ خانہ
راس آئی نہ فضا بیرونی

ایسے خائف ہوں زمانے بھر سے
جیسے بھاگا ہوا کوئی خونی

ہر کوئی کرتا ہے یوں من مانی
جیسے قانون ہو لاقانونی

خوبصورت ہے ہوس کی ناگن
پھیل جائے نہ سمِ قارونی

کم سخن جور کشِ کم نظری
فائزِ مسندِ فن باتونی

آ ذرا تیز چلیں اے تائب
منزلِ زیست ہے کتنی سونی

☆☆☆☆

o

مرکز سے اپنے میں ہوں کچھ ایسے ہٹا ہوا
جیسے کوئی پتنگ خلا میں کٹا ہوا

اب میرے دل میں نقش ابھرتا نہیں کوئی
یہ آئنہ ہے گردِ سفر سے اٹا ہوا

آیا قبائے زیست کا ایک ایک چاک یاد
کالر کسی کا میں نے جو دیکھا پھٹا ہوا

یکسوئی چاہتا ہے ہراک پہلوئے حیات
لیکن ہے دھیان میرا برابر بٹا ہوا

اپنی طرف سے بھی مجھے کچھ کہنے دیجیے
کب تک سنائے جاؤں سبق میں رٹا ہوا

تجدیدِ رسم و راہ کسی سے کروں تو کیا
تائب میں اپنی ذات سے بھی ہوں کٹا ہوا

☆☆☆☆

o

شامِ غربت میں وہ مہ رُو بھی نہیں
دور تک نور کی خوشبو بھی نہیں

جس بیاباں میں جنوں لایا ہے
اس میں تو یاد کے آہو بھی نہیں

ہم سا بے مایہ کوئی کیا ہوگا
اپنی آنکھوں میں تو آنسو بھی نہیں

گردشِ دہر ہو کیسے بس میں
اپنے حق میں تو وہ ابرو بھی نہیں

جانے اس ضد کا نتیجہ کیا ہو
مانتا دل بھی نہیں تو بھی نہیں

روگ جو تجھ کو لگا ہے تائب
اس کا پیارے کوئی دارو بھی نہیں

☆☆☆☆

o

طلبِ سود کہاں کام آئی
ہر کہیں خوئے زیاں کام آئی

برف زادوں کو پگھلتے دیکھا
حدّتِ شعلہء جاں کام آئی

گوشے گوشے میں ہے پتّوں کی بہار
صحن سونے تھے خزاں کام آئی

کب ہوا روح کا احوال بیاں
کس جگہ میری زباں کام آئی

زندگی نام گھٹن کا ٹھہرا
کیا مری طبعِ رواں کام آئی

اپنی پہچان کچھ آسان ہوئی
طنزِ آشفتہ سراں کام آئی

☆☆☆☆

○

عجب رفعتوں کے سزاوار ہیں ہم
مہِ خوں سرِ مطلعِ دار ہیں ہم

جو رکھتے ہیں گرمِ فغاں بے بسوں کو
انھی سرد جذبوں کا اظہار ہیں ہم

گرفتارِ خود جس میں حسنِ ازل ہے
اسی کرب کے آئنہ دار ہیں ہم

اندھیروں کے جنگل میں ہیں پاشکستہ
مگر عازمِ شہرِ انوار ہیں ہم

سرِ راہِ دل ہاتھ پھیلائے کب سے
ترے منتظر مثلِ اشجار ہیں ہم

دیارِ حقائق کو جائیں تو کیسے
اسیرانِ زندانِ افکار ہیں ہم

ہمارا مقدر ہے شامِ غریباں
کہ صبحِ طرب کے عزادار ہیں ہم

فضا دیکھ کر کُہر آلود تائب
خلافِ طبیعت شرربار ہیں ہم

☆☆☆☆

o

راز اب کوئی راز بھی تو نہیں
خامشی کا جواز بھی تو نہیں

درد ٹھہرے تو کس طرح ٹھہرے
وقفہء شب دراز بھی تو نہیں

رونقِ دل بحال ہو کیسے
نغمہ زن غم کا ساز بھی تو نہیں

ختم کیا بحرِ غم ہو؟ رَو میں ابھی
ہمتوں کے جہاز بھی تو نہیں

جاں سر افراز ہو تو کیوں کر ہو
گردِ راہِ حجاز بھی. تو نہیں

جہل و دانش میں، نور و ظلمت میں
اب کوئی امتیاز بھی تو نہیں

پستیوں کا ہو کیا گلہ تائب
دل میں تابِ فراز بھی تو نہیں

☆☆☆☆

o

کسک جس دن سے کم کم ہوگئی ہے
طبیعت سخت برہم ہوگئی ہے

ہماری داستانِ سادہ سن کر
کسی کی آنکھ کیوں نم ہوگئی ہے

نئے فتنوں کا ہے یہ پیش خیمہ
نظر جو دل کی محرم ہو گئی ہے

جمال و جلوہ کی بڑھتی کشش میں
نظر کی تاب مدھم ہو گئی ہے

نگاہِ عام سے کچھ فاصلے پر
حسیں کچھ اور شبنم ہوگئی ہے

تلاش آسودگی کو کرتے کرتے
پریشاں نسلِ آدم ہوگئی ہے

تضاداتِ جنوں منزل کا تائب
ہماری زیست سنگم ہوگئی ہے

☆☆☆☆

o

گزرا جو درد حد سے تو میں نے کہی غزل
کوشش کے باوجود نہ ورنہ ہوئی غزل

جس میں خلوص بھی ہو، کسک بھی، امنگ بھی
مطرب غزل ہو آج تو ایسی کوئی غزل

اس میں رچی بسی ہے مہک زلفِ یار کی
ہے دل کی دھڑکنوں کی امیں آج بھی غزل

مثلِ سحر لطیف تو مانندِ شب عمیق
شعلہ کبھی ، صبا کبھی ، شبنم کبھی غزل

امن و اماں میں ہے یہ محبت کی راگنی
آیا جو دورِ جنگ رجز بن گئی غزل

تصویر اپنے عہد کی بھی اس میں دیکھ لو
آئینہ دارِ عصر ہمیشہ رہی غزل

وہ فکر کی سلاست و ندرت کہاں سے لاؤں
تائب جو چاہتی ہے نئے دور کی غزل

☆☆☆☆

o

آنکھ سے مہتاب جب اوجھل ہوا
اک ستارہ ٹوٹ کر مشعل ہوا

سر زمینِ روح پیاسی تھی بہت
بارشِ غم سے عجب جل تھل ہوا

دل میں اتریں اپسرائیں یاد کی
آج اس جنگل میں بھی منگل ہوا

آپ کیوں ہنسنے لگے ہیں بے طرح
میں تو سودائی ہوا پاگل ہوا

ہے عذابِ جاں، بیانِ اضطراب
میں غزل کہہکر بہت بے کل ہوا

زندگی تائب ورائے فہم تھی
جاں سے جب گزرے معمّہ حل ہوا

☆☆☆☆

o

اک نیا کرب مرے دل میں جنم لیتا ہے
قافلہ درد کا کچھ دیر جو دم لیتا ہے

رنگ پاتا ہے مرے خونِ جگر میں گُلِ شعر
سبزۂ فکر مری آنکھ سے نم لیتا ہے

ذہن بھٹکا ہوا ملتا ہے برابر اس کو
آج فنکار جو ہاتھو ں میں قلم لیتا ہے

فکر کے ساتھ جسے دولتِ احساس ملے
چین وہ کا رگہِ زیست میں کم لیتا ہے

چاند بن جاتا ہے ہر حرفِ صداقت تائب
جب بھی سقراط کوئی ساغرِ سم لیتا ہے

☆☆☆☆

○

شعر کی قدر شہر میں کیا تھی
بات میری صدا بہ صحرا تھی

ذہن کا حبس جس سے ٹوٹ گیا
وہ نئی روشنی کی پُروا تھی

میں تماشا تھا اک جہاں کے لیے
اس پہ بھی حسرتِ تماشا تھی

فکر کے ساتھ جسے دولتِ احساس ملے
چین وہ کا رگہِ زیست میں کم لیتا ہے

چاند بن جاتا ہے ہر حرفِ صداقت تائب
جب بھی سقراط کوئی ساغرِ سم لیتا ہے

☆☆☆☆

○

شعر کی قدر شہر میں کیا تھی
بات میری صدا بہ صحرا تھی

ذہن کا حبس جس سے ٹوٹ گیا
وہ نئی روشنی کی پُروا تھی

میں تماشا تھا اک جہاں کے لیے
اس پہ بھی حسرتِ تماشا تھی

میرے کس کام تیرے ہنگامے
میری تنہائی تھی مری ساتھی

کم نہ تھی فتنہ ہائے دوراں سے
وہ قیامت جو دل میں برپا تھی

جاں سپاری کی جب نہ تھی توفیق
سربلندی کی کیوں تمنا تھی

تج کے دنیا کو جب چلے تائب
ساتھ اک خواہشوں کی دنیا تھی

☆☆☆☆

o

ذہن و دل کو بسا گئی خوشبو
نافۂ فن کی سرمدی خوشبو

جانے کس کنجِ گل سے آئی ہے
یہ جنوں خیز اجنبی خوشبو

یا تھی زنجیر میرے پاؤں کی
یا مری رہگزر بنی خوشبو

تازہ کرتی ہے زخمِ دل ہر شے
شبنمیں پھول ، مدھ بھری خوشبو

کوئی ایسے سمے کہاں جائے
رات، برسات، نغمگی، خوشبو

میں نہ کیوں اس پہ جان دوں تائب
جب نبیؐ کو پسند تھی خوشبو

☆☆☆☆

○

کیوں نہ دل کو ہو تیری یاد عزیز
کس کو اپنا نہیں مفاد عزیز

روند کر پھول آرزوؤں کے
شکر ہے ہو گئے ہیں شاد عزیز

دے گئے ہیں نشانیاں غم کی
مجھ کو آتے رہیں گے یاد عزیز

تو ہی اے بے کسی سہارا دے
چل دیئے کہہ کے خیر باد عزیز

مجھ کو جب خود پہ اعتماد نہیں
کیوں کریں مجھ پہ اعتماد عزیز

یہ بھی اب میرا جی جلاتے ہیں
تھے کبھی مجھ کو ابروباد عزیز

☆☆☆☆

○

منزلِ جاناں کتنی کڑی ہے
قدم قدم پہ دار گڑی ہے

دشنۂ غم ہے لمحہ لمحہ
تیرِ ملامت گھڑی گھڑی ہے

کنجِ قفس کے رہنے والو
آزادی بھی قید کڑی ہے

وہ ہیں اور محفل آرائی
ہم ہیں اور اشکوں کی جھڑی ہے

ذہن ہے اور سوچوں کا صحرا
آنکھ بس اک چہرے پہ گڑی ہے

کس کو خبر کیوں دل کی بستی
مدت سے ویران پڑی ہے

تائب سچائی کا دعویٰ
منہ چھوٹا اور بات بڑی ہے

☆☆☆☆

○

غم پیار میں پائے ہیں کیا کیا ہم نے غمِ دوراں سے پہلے
دل کی زینت تھے زخم کئی اس کربِ نمایاں سے پہلے

اظہارِ پریشاں حالی کی نوبت یہ بتدریج آئی ہے
چپ چاپ سہے کتنے صدمے اس چاکِ گریباں سے پہلے

غنچوں سے تبسم روٹھ گیا پتّوں کی زبانیں سوکھ گئیں
یہ کیسی ہوائیں آئی ہیں آغازِ بہاراں سے پہلے

پروانے کی کیا حالت تھی پوچھا ہو تا پروانے سے
اک شعلہء لرزاں سے پہلے اک شمعِ فروزاں سے پہلے

مرنا ہی تو ہے مر جائیں گے اے موت ابھی کچھ دن کے لیے
دو ہاتھ ہمیں کر لینے دے اس عمرِ گریزاں سے پہلے

میں اپنے گناہوں کو تائب دھونے کا ارادہ رکھتا تھا
رحمت نے بڑھ کر تھام لیا ہے اشکِ فراواں سے پہلے

☆☆☆☆

o

بے کیف ہے حیات کوئی پوچھتا نہیں
اے ربِ کائنات کوئی پوچھتا نہیں

انساں کے مرتبے کی ہے تیرے جہاں میں قدر
انسان کی صفات کوئی پوچھتا نہیں

اختر شماریوں میں گزاری ہے کس طرح
غم کی طویل رات کوئی پوچھتا نہیں

میری شکستِ فاش کو سب دیکھتے رہے
کیسے ہوئی یہ مات کوئی پوچھتا نہیں

تائب ہے اپنی اپنی سبھی کو پڑی ہوئی
اک دوسرے کی بات کوئی پوچھتا نہیں

☆☆☆☆

○

میں ہوں اور گردشِ ایّام خدا خیر کرے
ایک ٹھوکر ہے بہر گام خدا خیر کرے

پھر سے ہیں قلب و نظر، لطف و کرم کے مرکز
مجھ کو معلوم ہے انجام خدا خیر کرے

مطربِ زیست نے اک راگ جونہی چھیڑا تھا
چھا گئے حسرت و آلام خدا خیر کرے

سوزِ شب، آہِ سحر، گریہء پیہم، ٹیسیں
ایک دل اس قدر انعام خداخیر کرے

تیری اس نیم نگاہی سے مجھے الفت ہے
یہ حکایت بھی ہوئی عام خدا خیر کرے

میں جو رسوائے جہاں تھا تو کوئی بات نہ تھی
وہ بھی ہیں عشق میں بدنام خدا خیر کرے

کیا کہوں قصرِ محبت کی زمیں بوسی کا
ایک تائب پہ ہے الزام خدا خیر کرے

☆☆☆☆

o

غم سے اس درجہ پیار ہے دل کو
اب خوشی ناگوار ہے دل کو

راس ہرگز نہیں سرور و نشاط
بے قراری قرار ہے دل کو

اُس کے ملنے کی آرزو نہ کرے
یہ کہاں اختیار ہے دل کو

آج بھی بے جھجک چلے آؤ
آج بھی انتظار ہے دل کو

بے طلب کون کس سے ملتا ہے
بے سبب اعتبار ہے دل کو

جانے کیا دل کو ہو گیا تائب
التفات ان کا بار ہے دل کو

☆☆☆☆

o

کہتا ہے کون تجھ سے مسرت کی بھیک دے
تو میرے دل کو دردِ محبت کی بھیک دے

حیرت کی بھیک ملتی رہی ہے اسے مدام
میری نظر کو آج زیارت کی بھیک دے

میں بھی غمِ حبیب سے کرلوں ذرا سا پیار
مجھ کو زمانہ تھوڑی سی فرصت کی بھیک دے

اس سے میں اپنا قصّۂ غم کہہ کے دیکھ لوں
اک بار وہ اگر مجھے خلوت کی بھیک دے

پس ماندہ میری عقل ہے محدود میری سوچ
مولا! مرے شعور کو وسعت کی بھیک دے

☆☆☆☆

○

دل کی ہر ایک بات کے آئینہ دار ہیں
آنسو گزارشات کے آئینہ دار ہیں

جذبات کا فشار، طبیعت کا انتشار
باطن کی واردات کے آئینہ دار ہیں

اک بے رخی کی بات پہ جاناں سے سو گلے
گہرے تعلقات کے آئینہ دار ہیں

ذرّوں کے دل سے پھوٹے توانائی کے پہاڑ
جولانیء حیات کے آئینہ دار ہیں

صہبائے جاں فزا سے چھلکتے ہوئے سبو
اس چشمِ التفات کے آئینہ دار ہیں

تائب میر ی غزل کے یہ اشعارِ کم نما
میرے تاثرات کے آئینہ دار ہیں

☆☆☆☆

o

زندگی جب سے ترے نام کی جاگیر بنی
کسی صحرا میں سحر کی کوئی تصویر بنی

بیم و امید کے بے نام سفر میں رہنا
خوب خوابوں کے مسافر کی بھی تقدیر بنی

کشش اس در کی پروبال ہوئی میرے لیے
گردِ رہ جانِ حزیں کے لیے اکسیر بنی

بار ہا ہم نے بھی چاہا کہ کوئی کام کریں
بارہا یاد تری پاؤں کی زنجیر بنی

شوخیء جُثم کی معراج یہی ہے شاید
شوخیء چشم ہی اب شوخیء تقریر بنی

جانتا کون تھا تائب کو زمانے بھر میں
اُنؔ کی نسبت ہی سے ناچیز کی توقیر بنی

☆☆☆☆

o

لائے ہیں رنگ اشک ہمارے فراق میں
بے آب ہوگئے ہیں ستارے فراق میں

جب سے گئے ہو رنگِ چمن ہی کچھ اور ہے
افسردہ ہو رہے ہیں نظارے فراق میں

لیکن جیے بغیر بھی چارہ نہیں کوئی
جینا ہے گو عذاب تمھارے فراق میں

دامانِ زندگی نہ مگر ہاتھ سکا
بہتیرے ہم نے ہاتھ پسارے فراق میں

دراصل جینے والوں کی اک نقل یہ بھی ہے
جیتے ہیں جیسے درد کے مارے فراق میں

تائب اسے فراق ہے بڑھ کر وصال سے
جو ساری زندگی ہی گزارے فراق میں

☆☆☆☆

○

آپ کا نقشِ پا غنیمت ہے
یہی منزل نما غنیمت ہے

خوبیٔ بخت سے جو مل جائے
کوئی غم آشنا غنیمت ہے

زیست کے دشت میں تھی دھوپ ہی دھوپ
بادلوں کی ردا غنیمت ہے

بے مرادی میں جو نصیب ہوا
یہ غمِ دلکشا غنیمت ہے

یاس کے پھیلتے دھندلکوں میں
میرا دستِ دعا غنیمت ہے

زر پرستی کے اس زمانے میں
اعتبارِ وفا غنیمت ہے

ناشناسی کے دور میں تائب
جو ملے ہم نوا غنیمت ہے

☆☆☆☆

○

مت جان مجھ پہ سلسلہ آزار کا رکا
کس وقت اور کہاں عملِ ارتقا رکا

لٹنے کا خوف سب کے سروں پر سوار تھا
آرام کے لیے جو ذرا قافلہ رکا

سیمابِ آرزو کو کہاں آسکا قرار
کب جادۂ طلب میں کوئی بادپا رکا

دم گھٹ رہا ہے زیست کی قدروں کا اس طرح
لگتا ہے سانس آب وہوا کا رکا رکا

تائب ادب میں یوں ہے تصور جمود کا
جیسے کہیں ہو ناقۂ صبح و مسا رکا

☆☆☆☆

○

کسی کی جستجو میں سوچنے کی کس کو فرصت ہے
جہانِ رنگ و بو میں سوچنے کی کس کو فرصت ہے

اسیروں نے قفس کی قید میں کیا کچھ نہ سوچا تھا
چمن کی ہاؤ ہو میں سوچنے کی کس کو فرصت ہے

تقاضے ابر و باراں اور فصلِ گل کے کیا کیا تھے
یہاں جوشِ نمو میں سوچنے کی کس کو فرصت ہے

ہمارے جذبہء دل کا بالآخر حشر کیا ہوگا
ہجومِ آرزو میں سوچنے کی کس کو فرصت ہے

بہار آئی مگر اندیشہ ہائے نَو بنَو لے کر
لبِ ساغر کو چومیں سوچنے کی کس کو فرصت ہے

☆☆☆☆

○

پورے نہ ہو سکے کبھی آسودگی کے خواب
تاریکیوں میں ڈوب گئے روشنی کے خواب

وہ زندگی ہوئی نہ میسّر تمام عمر
اک عمر دیکھتے رہے جس زندگی کے خواب

غم میں رہے خوشی کے تصور سے ہمکنار
تیرہ شبوں میں دیکھا کیے چاندنی کے خواب

بچپن سے دل میں رہ کے بھی جو اجنبی رہا
دیکھے ہیں سوتے جاگتے ہم نے اسی کے خواب

اب کارو بارِ زیست سے تائب کہاں فراغ
اب میں ہوں اور لذّتِ آوارگی کے خواب

☆☆☆☆

o

پردیس میں اس طور ہے یاروں کا تصوّر
منجدھار میں جیسے ہو کناروں کا تصوّر

جھرنوں کی صدا کرتی ہے پیچھا مرا اب بھی
اک آگ لگاتا ہے چناروں کا تصوّر

لہراتے ہوں شاداب کنول جھیل میں جیسے
جاں بخش ہے یوں اس کے اشاروں کا تصوّر

ڈرتا ہوں نگل لے نہ شبِ غم کی سیاہی
خوابوں کے شفق زار، بہاروں کا تصوّر

اک تازہ جنوں دل کو عطا کرتا ہے تائبؔ
چاہت کی کٹھن راہگزاروں کا تصوّر

☆☆☆☆

o

لفظ سے جب نہ اٹھا بارِ خیال
کیسے کیسے کیا اظہارِ خیال

دل میں جب درد کی قندیل جلی
تمتمانے لگے رخسارِ خیال

روح کے زخم نہ مرجھائیں کبھی
تا ابد مہکے چمن زارِ خیال

غم پہ موقوف ہے تاثیرِ بیاں
غم سے ہے رونقِ بازارِ خیال

وادیء شب کا مسافر ہوں مگر
ہمسفر میرے ہیں انوارِ خیال

راکبِ فہم ہے بے بس تائب
اور منہ زور ہے رہوارِ خیال

☆☆☆☆

○

اسیرِ غم جو نہ ہوتے تو زندگی کیا تھی
یہی ستم جو نہ ہوتے تو زندگی کیا تھی

غم و الم ہیں نگارِ حیات کے زیور
غم و الم جو نہ ہوتے تو زندگی کیا تھی

رہِ وفا کا ہر اک مرحلہ کٹھن ہی سہی
یہ پیچ و خم جو نہ ہوتے تو زندگی کیا تھی

یہ الجھنیں یہ جھمیلے ہمارے دم سے ہیں
جہاں میں ہم جو نہ ہوتے تو زندگی کیا تھی

☆☆☆☆

o

نت نئے داغ، نت نئے چرکے
زندگی ! ہاں ستالے جی بھر کے

دل لگایا تو اک ستم گر سے
کھائی ٹھوکر تو ساتھ پتھر کے

حسرتِ بیکراں، غمِ وافر
اب سہارے ہیں جانِ مضطر کے

دل کا سب حال کہہ دیا اس نے
مجھ پہ احساں ہیں دیدۂ تر کے

ذہن کو روشنی سی دیتے ہیں
خال و خط اس جمیل پیکر کے

جانے کن منزلوں کے راہی ہیں
قافلے مہر و ماہ و اختر کے

ہم نے غم پائے مستقل تائب
شادمانی کی آرزو کرکے

☆☆☆☆

○

وہ لب پر پیار کا اقرار لائے
مرے ارمان برگ و بار لائے

مسائل بھی سلجھتے ہی گئے جب
وسائل کو بروئے کار لائے

پذیرا ہو وفاداری کا ہدیہ
ہم اپنے پیرہن کے تار لائے

تبسم لائے وہ اپنے لبوں پر
دوائے خاطر بیمار لائے

نظر میں اک جہانِ رمز و معنی
جلو میں نکہت و انوار لائے

نئی باتیں نہ لائے گرچہ تائب
نیا پیرایۂ اظہار لائے

☆☆☆☆

○

جب سے مجھ کو جنوں نہیں اے دوست
ایک لحظہ سکوں نہیں اے دوست

ان کا اس درجہ مہرباں ہونا
کوئی اچھا شگوں نہیں اے دوست

ٹوٹ جائے جو ایک رنجش سے
پیار ایسا فسوں نہیں اے دوست

بِن کہے بھی جو ہو سکے ظاہر
حال ایسا زبوں نہیں اے دوست

کیسے ممکن مرض کی ہو تشخیص
جب رگوں ہی میں خوں نہیں اے دوست

زیست کیجے تو کس طرح کیجے
درد بھی جب فزوں نہیں اے دوست

○

وہ زخم تھا جو پھوٹا
وہ تیر تھا جو چھوٹا

تارا تھا کہ آنسو تھا
یا چمکا تھا یا ٹوٹا

یہ کیسی ہوا آئی
مرجھا گیا ہر بوٹا

نغمے کہاں بربط میں
اک شعلہ فقط پھوٹا

ہاتھوں سے گئی دنیا
دامن کوئی کیا چھوٹا

دل کیسا خزانہ تھا
ہر اک نے جسے لوٹا

جھوٹا تو وہ ہے لیکن
کون اس کو کہے جھوٹا

☆☆☆☆

o

نہ سمجھو غم جو بڑھ جاتے ہیں پلکیں بھیگ جاتی ہیں
خوشی کی بھیک جب پاتے ہیں پلکیں بھیگ جاتی ہیں

سکوتِ نیم شب سے جب کوئی نغمہ ابھرتا ہے
ستارے اشک بھر لاتے ہیں پلکیں بھیگ جاتی ہیں

کسی چشمِ نشاط آگیں نے جس کو رنگ بخشا تھا
وہ قصّہ جب بھی دہراتے ہیں پلکیں بھیگ جاتی ہیں

محبت میں بفیضِ وضعداری یوں بھی ہوتا ہے
لبوں پر قہقہے آتے ہیں پلکیں بھیگ جاتی ہیں

پریشاں خاطری پوشیدہ رکھنا سخت مشکل ہے
اگر ہم دل کو سمجھاتے ہیں پلکیں بھیگ جاتی ہیں

وہ جب شرمندہ ہوتے ہیں تو ہنس پڑتا ہوں میں اکثر
وہ جب احسان گنواتے ہیں پلکیں بھیگ جاتی ہیں

☆☆☆☆

o

گزرتے سر سے محشر دیکھنے تھے
یہ دن بھی زندہ رہ کر دیکھنے تھے

خبر کیا تھی مری ویراں نظر نے
ہلاکت ہی کے منظر دیکھنے تھے

جھلستے دیکھنا تھا کونپلوں کو
گلِ نو خون میں تر دیکھنے تھے

سفینہ بھی تھا کمزور اور اس نے
ابھی بپھرے سمندر دیکھنے تھے

جنہیں منزل کا اندازہ نہیں تھا
ہمیں ایسے بھی رہبر دیکھنے تھے

زہے قسمت بہاروں میں بھی تائبؔ
خزاں کے تیکھے تیور دیکھنے تھے